وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا

توثیق الکلام
فی
الإنصات خلف الإمام

تصنیف

حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات
حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب رحمہ اللہ
بانی دار العلوم دیوبند

دار الثناء للطباعۃ والنشر
وسیم مینشن نزد اردو بازار کراچی
0300-2824450

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا

توثيق الكلام

في

الإنصات خلف الإمام

تصنیف

حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب رحمہ اللہ

(المتوفی ۱۲۹۷ھ)

بانی دار العلوم دیوبند

مقدمہ

حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبد الحلیم چشتی صاحب مدظلہ

فاضل دار العلوم دیوبند

ورئیس قسم التخصص فی الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ

تخریج

محمد سلمان واحدی

ناشر

دار الثناء

للطباعة والنشر

0300-2824450

نام کتاب:..................توثیق الکلام في الإنصات خلف الإمام

نام مصنف:..................حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

سن اشاعت:..............رجب 1429ھ بمطابق جولائی 2008ء

مطبع:..................شفق پرنٹنگ پریس کراچی

0321-2037721

ناشر:..................دار الثناء للطباعة والنشر كراتشي

0300-2824450

ملنے کا پتہ

اسلامی کتب خانہ بنوریؒ ٹاؤن کراچی

بیت الاشاعت گلستان کالونی لیاری کراچی

مکتبۃ الہادی نزد جامعہ صدیقیہ شاہ فیصل ٹاؤن کراچی

مکتبہ عمر فاروقؓ بالمقابل جامعہ فاروقیہ شاہ فیصل ٹاؤن کراچی

اس کے علاوہ ملک کے مشہور کتب خانوں سے طلب فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلي ونسلّم علی رسوله الکریم وعلی آله وأصحابه ومن تبعهم باحسان الی یوم الدین، اما بعد!

اللہ تبارک وتعالیٰ نے امام الانبیاء سرکار دو عالم ﷺ کے اقوال، اعمال اور افعال کو قیامت تک کے لیے محفوظ فرمایا ہے، اور حضور اکرم ﷺ کے اقوال واعمال میں سے کوئی نہ کوئی قول وعمل مسالک اربعہ میں سے کسی نہ کسی مسلک میں رائج ومعمول بہ ہے۔

''امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا'' یہ مسئلہ ائمہ اربعہ میں مختلف فیہ ہے لیکن برصغیر کا ایک فرقہ اس طرح کے مسائل کو ''مسئلہ حق وباطل'' بنا کر خوب اچھالتا ہے اور ائمہ عظامؒ اور سلف صالحین (خصوصاً حنفیہ) کے بارے میں اپنی زبان کو ''خوب'' استعمال کرتے ہیں۔

''توثیق الکلام في الإنصات خلف الإمام'' حجۃ الاسلام معدن الحسنات والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب قدس اللہ سرہ کا اسی مسئلہ پر انتہائی مختصر مگر جامع اور لاجواب رسالہ ہے

چونکہ یہ رسالہ حضرت کے اپنے ایک شاگرد رشید کے سوال کا جواب جسے حضرتؒ نے اپنے مخصوص انداز میں تالیف فرمایا ہے لہٰذا اسے سمجھنا ہر ''آدمی'' کے بس میں نہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا سعید احمد پالن پوری صاحب زید مجدہٗ ''شرح توثیق الکلام''

میں لکھتے ہیں:

''حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ قدس اللہ سرہ کی یہ کتاب درحقیقت آپ کا ایک مکتوب ہے جو آپ نے نانوتہ سے اپنے کسی تلمیذ کے سوال کے جواب میں ارقام فرمایا ہے، کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔'' (ص ۳۷)

ہمارے پیش نظر اس رسالہ کے دو نسخے ہیں اور دونوں مختلف ناموں سے طبع ہوئے ہیں، ان میں سے ایک ''توثيق الكلام في الإنصات خلف الإمام'' کے نام سے چھپا ہے۔

اس نام سے حضرت مولانا محمد یحیٰؒ صاحبؒ (تاجر کتب ومدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور، والد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہٗ) نے سرکار پریس سہارن پور سے چھپوایا تھا، اس پر سن طباعت درج نہیں ہے، البتہ اس کے آخر میں حضرت نانوتویؒ، حضرت حاجی صاحب مہاجر مکیؒ، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت تھانویؒ کی کتب کا اشتہار دیا ہے اور حضرت تھانویؒ کے ساتھ ''دام مجدہم'' لکھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ نسخہ حضرت تھانویؒ کی حیات میں طبع ہوا تھا (اور حضرت تھانویؒ کا وصال ۱۳۶۲ھ بمطابق ۱۹۴۳ء میں ہوا، گویا یہ نسخہ تقسیم ہندوستان سے قبل کا ہے)۔

اس رسالہ کا دوسرا نام ''الدليل المحكم على قراءة الفاتحة للموتم'' ہے، اس نام سے مولوی محمد عبدالاحد صاحب نے ماہِ شوال ۱۳۰۸ھ میں مطبع مجتبائی واقع دہلی سے مولوی محمد فضل الرحمٰن صاحب کی تصحیح سے شائع کرایا (اس

نسخہ کے آخر میں حضرت نانوتویؒ کا ایک فتویٰ مسئلہ تقلید وتراویح سے متعلق ہے، جسے زیر نظر رسالہ کے آخر میں بھی شامل کر دیا گیا ہے۔)

''میر محمد کتب خانہ آرام باغ کراچی'' سے چند سال قبل ''نادر مجموعہ رسائل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ'' کے نام سے دس رسائل شائع ہوئے تھے جن میں ایک رسالہ ''الدلیل المحکم'' بھی تھا۔

ہمیں اس رسالہ کے دو مختلف ناموں سے چھپنے کی وجہ معلوم نہیں ہوسکی۔ البتہ ان دونوں نسخوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ تین مقامات پر ''توثیق الکلام'' کی عبارت زیادہ ہے اور ایک مقام پر ''الدلیل المحکم'' کی عبارت زائد ہے۔ (اس کی نشاندھی ان مقامات پر کر دی گئی ہے۔)

اس رسالہ کی تصحیح آخری مراحل میں تھی کہ ایک ساتھی کے ذریعہ معلوم ہوا کہ اس رسالہ کی شرح حضرت مولانا سعید احمد پالن پوری صاحب زید مجدہٗ نے فرمائی تھی جو ۱۳۹۷ھ بمطابق ۱۹۷۷م میں مکتبہ وحیدیہ دیوبند سے شائع ہوئی تھی، لہٰذا مذکورہ بالا دونوں نسخوں سے تصحیح کے بعد ایک مرتبہ اس شرح سے بھی اس کی تصحیح کی گئی ہے۔

ہماری معلومات کے مطابق پاکستان میں یہ رسالہ درج ذیل خصوصیات کے ساتھ پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا ہے:

۱. احادیث کی تخریج کی گئی ہے۔
۲. عمدہ کمپوزنگ کا اہتمام کیا گیا ہے۔

③ پیراگراف اور املاء وترقیم کی رعایت کی گئی ہے۔
④ مشکل الفاظ کے معانی حاشیہ میں "فیروز اللغات" سے نقل کئے گئے ہیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے اس رسالہ کی اشاعت کی توفیق بخشی اور اپنے استاذ محترم حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی صاحب مدظلہم کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے اپنے قیمتی اوقات میں سے وقت نکال کر بندہ کی خواہش پر "مقدمہ" لکھا، اور ان تمام حضرات کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے اس رسالہ کے سلسلے میں مجھ سے تعاون کیا ہے خصوصاً ہمارے محترم دوست مفتی نور الرازق حقانی صاحب اور مولوی علی احمد صاحب (شریک تخصص فی الحدیث) کا، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس پر بھر پور اجر عطا فرمائیں۔ اور اس رسالہ کو میرے لیے ذریعہ نجات بنائے اور خدمت دین کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بندہ

محمد سلمان واحدی

فاضل جامعہ امام ابو حنیفہؒ (مکہ مسجد) آدم جی نگر کراچی

متخصص فی الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوریؒ ٹاؤن کراچی

بروز اتوار ۱۴۲۹/۶/۲۴ھ بمطابق ۲۰۰۸/۶/۲۹م

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

از حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبد الحلیم چشتی صاحب مدظلہ

(نگران شعبہ تخصص فی الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن)

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۴۸ھ-۱۲۹۷ھ=۱۸۳۳م-۱۸۸۰م) نہایت جامع صفات وکمالات بزرگ تھے، وقت کے نامور اہل کمال سے علوم کی تحصیل کی، چنانچہ علوم متداولہ کی سند میں وہ سند ہیں۔

علومِ طریقت میں ان کا جو پایہ ہے اس کے متعلق ان کے شیخِ طریقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (۱۲۳۳ھ-۱۳۱۷ھ=۱۸۱۷م-۱۸۹۹م) نے ضیاء القلوب[1] (مطبع مجتبائی ممتاز علی ص ۶۰) میں ان کے اور ان کے رفیق درس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۲۴۴ھ-۱۳۲۳ھ=۱۸۲۹م-۱۹۰۵م) کے متعلق جو الفاظ لکھے ہیں وہ اس باب میں ان کی رفعت شان کی نہایت روشن دلیل ہیں، فرماتے ہیں:

"ونیز ہر کس کہ ازیں فقیر محبت وعقیدت وارادت دارد مولوی رشید احمد سلمہ را و مولوی محمد قاسم سلمہ را کہ جامعِ جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند

---

(۱) ضیاء القلوب کا عربی ترجمہ جو حاجی صاحبؒ کی زندگی میں ان کے مجاز وخلیفہ مولانا محمد حسین الہ آبادی نے کیا تھا، دعا فرمائیں اسے جلد شائع کیا جا سکے۔ (چشتی)

بجائے منِ فقیر راقم اوراق بلکہ بمدارج فوق از من شمارند اگر چہ بظاہر معاملہ برعکس شد کہ اوشان بجائے من و من بمقام اوشان شدم وصحبت اوشان را غنیمت دانند کہ این چنیں کسان دریں زمان نایاب اند واز خدمتِ بابرکت ایشان فیض یاب بودہ باشند۔"

ترجمہ: اور نیز ہر شخص جو اس فقیر سے محبت، عقیدت وارادت کا تعلق رکھتا ہے مولوی رشید احمد سلمہ اور مولوی محمد قاسم سلمہ جو کہ تمام کمالاتِ علوم ظاہری و باطنی کے جامع ہیں کو مجھ فقیر راقِم سطور کی جگہ بلکہ مجھ سے بالاتر مراتب میں سمجھے، اگر چہ بظاہر معاملہ برعکس ہے کہ وہ میری جگہ اور میں ان کی جگہ ہوں اور ان کی صحبت غنیمت خیال کرے کیوں کہ ان جیسے لوگ اس دور میں نایاب ہیں اور ان کی بابرکت خدمت سے فیض یاب ہوتا رہے۔

زندگی بھر دین کی خدمت اور اسلام کی سربلندی کے لیے کوئی موقعہ ایسا نہیں آیا جس میں گو نے سبقت نہ لے گئے ہوں۔

وہ عربی، فارسی اور اردو کے شاعر وشگفتہ نگار ہیں، میدانِ کارزار میں آگے آگے رہے، پڑھایا، علماء تیار کئے، گمراہ فرقوں کی تردید میں رسالے لکھے، پادریوں اور پنڈتوں سے مباحثہ کیا، اور حق کا بول بالا کیا، حکومت سے جہاد کیا، اہل حدیثوں کو جواب دیا، شیعوں کی تردید میں قلم اٹھایا، تیرھویں صدی ہجری میں دو ایسے نامور، ہم عصر علامہ ومصنف گذرے ہیں

جن میں سے ہر ایک کی نظیر ہندوستان کیا بیرون ہند میں بھی کم ہی ملے گی۔
ان میں ایک اودھ (لکھنؤ) میں مولانا عبدالحی لکھنویؒ (۱۲۶۴ھ -۱۳۲۳ھ =۱۸۲۹م-۱۹۰۵م) ہیں جن کی تحقیقات وتعلیقات وحواشی حوالوں کی کثرت وندرت سے ایسی روشن وتابناک ہیں، جس کی روشنی سے عالم اسلام روشن ہے۔

دوسرے دوآبہ نانوتہ ضلع سہارن پور میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۴۸ھ-۱۲۹۷ھ=۱۸۳۳م-۱۸۸۰م) اور ان کے ہم درس ورفیق حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۲۴۴ھ-۱۳۲۳ھ=۱۸۲۹م-۱۹۰۵م) ہیں جن کی تحقیقات نادرہ اور تصنیفات مفیدہ حوالوں کی منت پذیری سے بے نیاز ہیں ان کی نظیر بھی عالم اسلام میں ملنا مشکل ہے۔

خود حضرت نانوتویؒ کو بھی اس بات کا اعتراف ہے اسی زیر نظر کتاب کے ص ۴۴ میں لکھتے ہیں:

''کیا کہئے اس ویرانہ میں مواد کتب حدیث کا بالکل پتہ نہیں اور دیو بند اور سہارن پور میں اگر بعض کتابیں ہوں بھی تو یہاں سے دور، علاوہ بریں کچھ بوجہ تواتر امراض ناتوانی کچھ قدیم (کذا) کی تن آسانی کتاب دیکھنی ایک موت ہے ورنہ اس باب میں بھی کچھ لکھتا، بناچاری اپنے ہی خیالات پر اکتفاء کرتا ہوں'' انتھی

حضرت نانوتویؒ کی تصانیف میں ہر بات مدلل ہے خصم کو بھی اس میں مجال سخن نہیں ہے، انداز بیان ایسا مدلل و دل نشین ہے کہ پڑھ کر انسان مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہ بات عام رسالوں اور کتابوں کی ہے جو مکاتیب اور کتابیں اربابِ حقائق اور اہل فن کے لیے ہیں وہ ہمارے تبصرہ سے بالاتر ہیں، فارسی والوں نے سچ کہا ؎

چہ خوش گفت دانا کہ دانش بسے است
ولیکن پراگندہ با ہر کسے است

اور سچ ہے ؎

ہر کہ دانا بود توانا بود

مناظر، مفتی، فقیہ، محدث، واعظ و خطیب تیار کئے، تلامذہ کی جماعت ساتھ رکھتے اور ان کی علمی، روحانی و اخلاقی تربیت کرتے، ہمارے علم کے مطابق ان کے آخری شاگرد مولانا حافظ عبدالرحمٰن امروہیؒ ہیں جن کا انتقال ۱۹۴۸م میں [1] ہوا۔

کتابوں کی تصحیح سے گذر بسر کی، مدرسہ بنایا، جو اَب دارالعلوم دیوبند کے نام سے عالَم میں مشہور ہے اور ایسے شاگرد چھوڑے جنہوں نے جگہ جگہ

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے: ماہنامہ تعمیر افکار کراچی، اشاعت خاص بیاد علامہ محمد طاسینؒ، مسلسل شمارہ (۶۱) جلد ۷، شمارہ ۶، ۷، ۸، کے صفحہ ۲۷۸۔

مدارس کا جال بچھایا، جن سے لاکھوں تشنگان علوم سیراب ہوئے، اور وہ سلسلہ آج بر اعظموں میں پھیلا ہوا ہے۔ ایشیا و افریقہ، یورپ و امریکہ کون سا ملک ایسا ہے جہاں ان کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد'' قال اللہ وقال الرسول'' کی صدائیں بلند نہیں کرتے۔

بے نفسی اور اخلاص کا یہ عالم کہ ناموری سے بچنے کے لیے دار العلوم کی بنیاد و تاسیس اور درس و تدریس میں پس پردہ رہ کر کردار ادا کیا، چنانچہ دار العلوم کے سنگ بنیاد کے موقعہ پر جب ہر کوئی خود کو کم تر سمجھ کر پہلی اینٹ رکھنے کو تیار نہ تھا، تو بالآخر پہلی اینٹ حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوریؒ سے رکھوالی گئی اور اس کے ساتھ ہی حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے حضرت میاں جی منے شاہ صاحب کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا اور فرمایا کہ: '' یہ وہ شخص ہیں جنہیں صغیرہ گناہ کا بھی کبھی تصور نہیں آیا''، تو انہوں نے حضرت محدث سہارن پوریؒ صاحب مطبع احمدی و حاشیہ موطا امام مالک و صحیح بخاری و جامع ترمذی و مشکوٰۃ المصابیح وغیرہ کے ساتھ اینٹ رکھی۔[۱]

ہمارے شاگرد محمد سلمان واحدی نے حضرت نانوتویؒ کا ایک مختصر رسالہ ''توثیق الکلام في الإنصات خلف الإمام '' پڑھا، وہ اس سے بہت متاثر ہوئے انہوں نے افادۂ عام کے لیے شائع کرنے کا ارادہ کیا، خود

(۱) پچاس مثالی شخصیات از قاری محمد طیب قاسمیؒ ص ۱۳۱۔

کمپوز کیا، نئے پیرے بنائے، ایک آدھ جگہ حاشیہ لگایا اور بعض احادیث کی تخریج بھی کی، مجھے سنایا، امید ہے ناظرین بھی اس سے لطف اندوز ہوں گے، مجھ سے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی، میرے پاس وقت نہیں، ان کے اصرار پر چند سطور لکھی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی پہلی کوشش کو قبول فرمائے، اور انہیں کام کی مزید توفیق عطاء فرمائے۔(آمین)

(مولانا ڈاکٹر) محمد عبدالحلیم چشتی

رئیس قسم التخصص فی علوم الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ

۱۸/ جمادی الاخری ۱۴۲۹ھ

بمطابق ۲۳/ جون ۲۰۰۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۙ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۙ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۙ آمين

اللّٰھم صلِّ علی سیدنا محمدنِ النبی الامی وازواجہ امہات المومنین وذریتہٖ واھل بیتہٖ کما صلیت علی سیدنا ابراھیم انک حمید مجید

بعد حمد وصلوٰۃ اول چند باتیں عرض کرتا ہوں اس کے بعد مطلب اصلی عرض کروں گا۔

اول تو یہ گذارش ہے کہ اوصاف دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک تو بالذات دوسرے بالعرض، مگر اوصاف بالعرض حقیقت میں وہی اوصاف موصوف بالذات ہوتے ہیں جو بوجہ ارتباط باہمی موصوف بالعرض کی طرف مجازاً منسوب ہوجاتے ہیں، چنانچہ مشاہدۂ احوال کشتی وجالسان کشتی سے واضح ہے۔

غرض یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس صورت میں وصف واحد ہوتا ہے پر

موصوف متعدد، کوئی موصوف بالذات کوئی موصوف بالعرض، پھر موصوف بالعرض بھی ایک موصوف بالذات کے لیے متعدد ہو سکتے ہیں۔

اور اسی تقریر سے یہ بھی واضح ہوگیا ہوگا کہ ضروریات وصف کی ضرورت فقط موصوف بالذات کو ہوگی البتہ آثار وصف موصوف بالعرض کی طرف وصف کے ساتھ آئیں گے، یہی وجہ ہے کہ اسبابِ محرکہ کی فقط کشتی کو ضرورت ہے البتہ تبدل اوضاع جو آثار حرکت میں سے ہے کشتی کی حرکت کی بدولت مثل کشتی کشتی نشین کو بھی میسر آ جاتا ہے۔

گذارش ثانی یہ ہے لفظ دال علی الوصف سے حقائق شناسوں کے نزدیک موصوف بالذات ہی مراد ہوگا، ہاں! اگر کوئی قرینہ صارفہ ہو تو اُس وقت موصوف بالعرض بھی مراد لے سکتے ہیں۔

عرض ثالث یہ ہے کہ جیسے ایک چیز کو باعتباراتِ مختلفہ معنی، مدلول، موضوع لہ اور مفہوم وغیرہ کہہ سکتے ہیں یا ایک شخص کو باعتباراتِ مختلفہ باپ، بیٹا، چچا، بھتیجا وغیرہ کہہ سکتے ہیں، ایسے ہی نماز کو باعتبارات مختلفہ صلوٰۃ، ذکر، طاعت، عبادت اور حسنہ وغیرہ کہہ سکتے ہیں مگر جیسے معنی و مدلول وغیرہ اسما یا باپ بیٹا وغیرہ القاب کے لیے اعتبارات جدا جدا ہیں اور آثار جدا جدا، مثلاً باپ کے لیے تعظیم ہے اور بیٹے کے ذمہ طاعت و خدمت، ایسے ہی نماز کے اسماء والقاب میں خیال کرنا ضروری ہے۔

عرض رابع یہ ہے کہ جیسے سائلوں کے عجز و نیاز و آداب و تعظیم و دعا و ثنا کو بایں وجہ کہ بغرض سوال ہوتے ہیں یا انجاح سوال کے بعد سوال پر متفرع ہوتے ہیں سب از قسم سوال سمجھے جاتے ہیں یا اُپلہ[1]، لکڑی وغیرہ سامانِ پُخت و پز[2] کھانے پینے کے مد میں لکھے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ سب کے دام لگا کر یوں کہا کرتے ہیں کہ کھاتیا اس مہینے میں اتنا صرف ہوا، ایسے ہی نماز کے اُن افعال کو جو باعتبارات ذات افعال اعتبار صلوٰۃ کے تلے ان کا داخل کرنا حقیقت شناس روا نہیں رکھ سکتا بایں نظر کہ مقصود اصلی اُن سے وہ اعتبار صلوٰۃ ہے یعنی اس کے سامان ہیں یا اس پر متفرع ہیں یعنی اس کے آثار ہیں داخل صلوٰۃ سمجھنا لازم ہے۔

مگر جیسے اُپلے، لکڑی کو باوجود لحوق مذکور نہ وہاں رکھ سکتے ہیں جہاں کھانے کو رکھتے ہیں اُن کے لیے اگر صحن یا کوٹھڑی تو اُن کے لیے دیگ رکابی وغیرہ، اور نہ وہ آثار اُن پر بذات خود متفرع ہوتے ہیں جو کھانے پر متفرع ہوتے ہیں، نہ ان میں وہ مزا ہے نہ راحت روح افزا ہے، روٹی وغیرہ کو پانی توے گھڑنے دھونے وغیرہ کی حاجات اور لکڑی، اُپلے وغیرہ کو آفتاب کی ضرورت، توڑنے پھوڑنے وغیرہ کی حاجت، ایسے ہی افعال صلوٰۃ و ملحقات صلوٰۃ کو باہم متغایر سمجھئے۔

---

(۱) اُپلہ کے معنی ایندھن کے لیے گوبر کے سکھائے ہوئے لڑے، (۲) پُخت و پز کے معنی پکانا۔

اور اگر اس سے بھی زیادہ روشن مثال کی ضرورت ہو تو سنئے!

رعایا کو بغرض عرض مطلب و استماع احکام شاہانہ دربارِ شاہی میں جانے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس وجہ سے تمام آداب و تعظیمات جو وقت حضوریٔ دربار بجالائے جاتے ہیں سوال ہی کے مد میں شمار کئے جاتے ہیں، مگر جیسے عرض مطلب کے لیے زبان اور استماع حکم کے لیے کان چاہئے حضوری دربار کے لیے شست وشوئی دست وپا وروئی [1] اور درستی لباس کی ضرورت ہے اگر حضور نہ ہوتا تو اس کی حاجت نہ تھی اور عرض مطلب اور استماع حکم نہ ہوتا تو زبان وکان کی حاجت نہ تھی ایسے ہی اعتبارِ صلوٰۃ کے اور احکام ہیں اور اعتبار حضور کے اور احکام ہیں البتہ جیسے عرض مطلب وغیرہ بے حضور متصور نہیں ایسے ہی تحقق اعتبار صلوٰۃ بے حضور متصور نہیں البتہ جیسے دربار کا جانا اور آداب کا بجالانا سب از قسم سوال ہی سمجھے جاتے ہیں اور کیوں کر نہ سمجھے جائیں، حضور دربار اسی لیے ہے بذاتِ خود مطلوب نہیں ایسے ہی اعتبار صلوٰۃ اور اعتبار حضور کو متعانق اور متلازم خیال فرمایئے۔

عرض پنجم یہ ہے کہ احکام انبیاء کرام علیہم السلام دو قسم کے ہوتے ہیں:

ایک تو از قسم روایت اور ایک از قسم درایت۔

اول میں تو احتمال خطا ممکن نہیں، انبیاء کرام علیہم السلام صادق ومصدوق

---

(۱) نہا دھو کر صاف کپڑے پہننا۔

ہوتے ہیں وہ راوی، خدا تعالیٰ مروی عنہ، خطا آئے تو کدھر سے آئے۔

ہاں! احکام قسم ثانی میں گاہ بگاہ خطا کا بھی احتمال ہوتا ہے اور اس لیے احتیاط کی بھی ضرورت ہوتی ہے البتہ اتنی بات مقرر ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی خطا کی اصلاح ضروری ہے اس دعوے پر احادیث کثیرہ شاہد ہیں، پھر اس پر مرتبہ بشریت سے دور نہیں اس لیے اس میں زیادہ کنج وکاؤ[1] کی حاجت نہیں۔

ان پانچ باتوں کے بعد یہ گذارش ہے کہ صلوٰۃ کے لیے طول تو ایک رکعت سے زیادہ نہیں، چنانچہ احادیث کثیرہ مثل من أدرك ركعة من الصلوٰة[2]، من أدرك ركعة من الجمعة[3]، من أدرك ركعة من

(۱) کنج وکاؤ: غور وفکر

(۲) مکمل حدیث یہ ہے: من أدرك ركعة من الصلاة فقد أدرك الصلاة، أخرجه البخاري في "صحيحه" رقم الحديث: ٥٥٥، باب من أدرك ركعة من الصلاة، ومسلم في "صحيحه" رقم الحديث: ١٣٧٠، كتاب المساجد، باب من أدرك ركعة من الصلاة، وأبوداود في "سننه" رقم الحديث: ١١٢١، كتاب الصلاة، باب من أدرك من الجمعة ركعة، والترمذي في "جامعه" رقم الحديث: ٥٢٤، أبواب الصلاة، باب فيمن أدرك من الجمعة ركعة، وابن ماجه في "سننه" رقم الحديث: ١١٢٢، باب ماجاء فيمن أدرك من الجمعة ركعة، والنسائي في "سننه" ج١ ص٢٧٤.

(۳) مکمل حدیث یہ ہے: من أدرك ركعة من الجمعة أو غيرها فقد تمت صلاته، أخرجه النسائي في "السنن" ج١ ص٢٧٤.

الصبح، من أدرك ركعة من العصر [1]، اس پر شاہد ہیں، ورنہ تخصیص رکعت لغو ہے۔

اور حدیث لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب [2] بعد لحاظ اس امر کے ہر رکعت میں ضرورت فاتحہ ہے وہ جس قسم کی ضرورت ہو اس کی مؤید ورنہ ایک سلام سے جتنی رکعتیں پڑھی جایا کریں ایک ہی فاتحہ کافی ہوا کرے۔ [3]

ادھر شب معراج میں بوجہ تخفیف پچاس نمازوں کے بعد فقط پانچ کارہ

---

(١) مکمل حدیث یہ ہے: من أدرك ركعة من الصبح قبل أن تطلع الشمس فقد أدرك الصبح، ومن أدرك ركعة من العصر قبل أن تغرب الشمس فقد أدرك العصر. أخرجه البخاري في "الصحيح" رقم الحديث: ٥٥٤، باب من أدرك من الفجر ركعة، ومسلم في "الصحيح" رقم الحديث: ١٣٧٣، والترمذي في "الجامع" رقم الحديث: ١٨٦، باب ماجاء فيمن أدرك ركعة من العصر قبل أن تغرب، وابن ماجه في "السنن" رقم الحديث: ٦٩٩، باب وقت الصلوة في العذر والضرورة، والنسائي في "السنن" ج١ ص٢٥٧.

(٢) مکمل حدیث یہ ہے: لا صلوة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب، أخرجه الإمام البخاري في "الصحيح" رقم الحديث: ٧٢٣، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم، ومسلم في "الصحيح" رقم الحديث: ٨٧٢، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة، والترمذي في "الجامع" رقم: ٢٤٧ باب ماجاء أنه لاصلوة إلا بفاتحة الكتاب، وأبوداود في "السنن" رقم: ٨٢٢، وفيه زيادة: "فصاعداً"، وابن ماجه في "السنن" رقم: ٨٣٧، باب القراءة خلف الإمام، والنسائي في "السنن" ج٢ ص١٣٧، إيجاب قراءة فاتحة الكتاب في الصلاة.

(٣) یہ عبارت "الدلیل المحکم" میں نہیں ہے۔

جانا اس طرف مشیر ہے کہ استحباب پچاس ہنوز باقی ہے اور کیوں نہ ہو مقتضاء تخفیف بشہادت عقل سلیم یہی ہے۔

اور اگر کہیں اس کے مخالف نظر آئے تو وہاں یہ تخفیف ہی باعث تقلیل نہیں ہوئی بلکہ لحاظ کسی حسن وقبح کا بھی شریک حال ہے۔

اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت وہمت سے یہ توقع ہے کہ آپ اس مستحب محبوب کو بے وجہ ترک نہ کرتے ہوں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ شب وروز کو تتبع کیا تو پچاس ہی رکعتیں ہوتی ہیں، ہاں! اگر کبھی دن کو کچھ کمی ہوئی تو رات کو غالباً جبر نقصان فرماتے تھے، اور رات کو کچھ نقصان رہ گیا تو دن کو اس کو پورا فرماتے تھے، اس معمول نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے تو اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ طول صلوٰۃ ایک رکعت تک ہے مگر چونکہ دشواری پچاس بار کی حاضری میں تھی گو ایک ایک رکعت کے لیے کیوں نہ ہو تو تخفیف میں تنقیص اوقات زیادہ ملحوظ رہے۔

علاوہ بریں فقہاء کا یہ ارشاد بھی کہ صبح کی ایک رکعت ملنے کی بھی امید ہو تو بطور معلوم سنت صبح کو ادا ہی کرلے کچھ یہی کہے ہے کہ وہ بھی صلوٰۃ ایک ہی رکعت کو سمجھتے ہیں یعنی جب تک ادائے صلوٰۃ بالجماعت ممکن ہو سنت مؤکدۂ صبح کو ترک نہ کرے دونوں فضیلتوں کو جمع کرلے، ہاں! اجتماع ممکن نہ ہو تو پھر جماعت زیادہ ضروری ہے۔

بایں ہمہ بعد اتمام رکعۃ، عوذ ارکان سابقہ بھی بحکم فطرتِ سلیمہ اسی پر دال ہے کہ صلوٰۃ واحد ایک رکعت پر ختم ہو جاتی ہے اس صورت میں دو دو رکعت اور تین تین رکعت اور چار چار رکعت کو ایک صلوٰۃ کہنا بایں اعتبار ہے کہ فصل بالاجنبی کی اجازت نہیں، مگر جیسے اس صورت میں صلوٰۃ متعددہ کو ایک صلوٰۃ بوجہ مذکور سمجھتے ہیں ایسے ہی صلوٰۃ امام و مقتدی کو جو بدلالت وجوہ لاحقہ واحد ہے بوجہ تعدد مصلین متعدد سمجھتے ہیں۔

وجہ اول تو یہ ہے کہ افضلیت امام علی الترتیب المعلوم اس بات پر شاہد ہے کہ جیسے حرکت کشتی نشین سرعت وبطوء استقامت واستدارت وغیرہ میں تابع حرکت کشتی ہے ایسے ہی فضیلت ونقصان میں صلوٰۃ مقتدی تابع صلوٰۃ امام ہے، یہی وجہ ہوئی کہ امام کا اَعلم واَقرأ واَورع وغیرہ ہونا محمود و مستحب ہوا، اگر دونوں کی نمازیں جدا جدا ہوتیں اور اس امر میں ایک دوسرے سے مستقل و مستغنی ہوتا تو آگے پیچھے کھڑا ہونا کچھ اس بات کو مقتضی نہ تھا کہ امام ایسا ہونا چاہئے ورنہ بہت سے منفرد بھی اس حکم کے مخاطب ہوتے۔

الغرض مثل کشتی وجالسان کشتی اگر امام کی طرف سے افاضہ اور مقتدیوں کی طرف سے استفاضہ نہیں تو یہ افضلیت امام پھر کاہے کے لیے ہے۔

دوسری (وجہ) حدیث الإمام ضامن [۱] اس بات پر شاہد ہے کہ امام

(۱) مکمل حدیث یہ ہے: الإمام ضامن والمؤذن موتمن، اللهم أرشد الأئمة واغفر

کی نماز فاسد ہو تو مقتدیوں کی نماز کا فساد لازم ہے اور مقتدی کی نماز فاسد ہو تو اسی کی نماز فاسد ہوگی اور کسی کی نماز فاسد نہ ہوگی۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ضمانت وجوب حق پر دال ہے اور ظاہر ہے کہ ادائے حق ضمانت سے اصل مدیون بری ہو جاتا ہے ورنہ بارِ دَین اس کی گردن پر رہے گا، اور مدیون اگر عوض مال مودیٰ ضامن کو نہ دے تو مدیون ہی کے ذمہ مطالبہ رہے گا، ضامن کے ذمہ کسی کا مطالبہ نہ رہے گا اس لیے یہ ضرور ہے کہ حق ضمانت امام سے ادا نہ ہو تو مقتدیوں کی برأت بھی متصور نہیں اور مقتدیوں سے واجب ادا نہ ہو تو امام کی برأت میں کلام نہیں۔

غرض فسادِ نمازِ امام سے مقتدیوں کی نماز کا فاسد ہو جانا بھی اس پر شاہد ہے کہ مثل حرکت کشتی، صلوٰۃِ امام مقتدیوں کی طرف منسوب ہو جاتی ہے اور جیسے کہ سکونِ کشتی سے سکونِ جالس ضرور ہے اور سکون جالس سے اُسی کا سکون لازم آتا ہے اوروں تک متعدی نہیں ہوتا ایسے ہی دربارۂ فساد یہاں بھی یہی حال ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جیسے بوجہ تندیٔ ہوا وغیرہ موجبات اضطراب، اگر کشتی مضطرب ہوتی ہے تو جالسان کشتی کا اضطراب یعنی تہ و بالا ہونا

للموذنين، أخرجه الترمذي في "الجامع" رقم الحديث: ۲۰۷، باب ماجاء أن الإمام ضامن، وأبوداود في "السنن" رقم الحديث: ۵۱۷، باب مايجب على المؤذن.

ضروری ہے اور فقط کشتی نشین کو اگر ہوا تند لگے تو نہ وہ تہہ و بالا ہو نہ کوئی اور سوا اس کے، اور وجہ اس کی وہی اتحاد حرکت بطور معلوم ہے اور اسی وجہ سے اس اضطراب وعدم اضطراب سے یہ سمجھ جاتے ہیں کہ ادھر سے افاضہ اور ادھر استفاضہ ہے ایسے ہی سہوِ امام سے سب پر سجدہ سہو کا لازم آنا اور مقتدی کے سہو سے کسی پر سجدہ کا لازم نہ آنا اتحادِ صلوٰۃ پر بطور معلوم دال ہے اور اس کو دیکھ کر اہل فہم یہ سمجھ جاتے ہیں کہ امام کی طرف سے افادہ اور ادھر سے استفادہ ہے۔

چوتھے رکوع وسجود میں تقدیم وتاخیر کا مقتدیوں کے حق میں ممنوع ہونا بشہادت فطرت سلیمہ اس پر شاہد ہے کہ امام ہی کی نماز مقتدیوں کی طرف منسوب ہے اور اس صورت میں اس معیت کی ضرورت ایسی ہے کہ جیسے آئینہ کے مستنیر ہونے کے لیے تقابل کی حاجت یا بذریعہ کشتی متحرک ہونے کے لیے کشتی کے ذیل میں ہونے کی ضرورت،[1] ورنہ درصورت استقلال یہ ممانعت لغو تھی۔

پانچویں امام کے سُترہ کا مقتدیوں کے حق میں کافی ہوجانا چنانچہ حدیث ابن عباسؓ[2] اس پر شاہد ہے اس پر دلالت کرتا ہے کہ اصل مصلی وہ

(۱) یہ عبارت ''الدلیل المحکم'' میں موجود نہیں ہے۔

(۲) سترہ کے باب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی دو روایات ہیں: (۱) ایک روایت یہ ہے:

امام ہے اور مقتدی اُس سے مستفیض ہیں۔

الغرض صلوٰۃ امام ومقتدی بوجوہ مذکورہ واحد ہے امام اصل اور موصوف بالذات ہے، اور مقتدی تابع اور موصوف بالعرض، اور کیوں نہ ہو اگر اختلاف تشکلات قمر وغیرہ امور معلومہ سے قضیہ نور القمر مستفاد من نور الشمس کا یقین ہوجاتا ہے تو یہاں بھی استفادہ معلوم کا یقین ضروری ہے۔

اس لیے ضروریات اعتبار صلوٰۃ یا یوں کہئے ضروریات اعتبار اتصاف بالذات مثل قراءت سب امام کے ذمہ رہیں گے اور ضروریات اتباع یا یوں کہئے ضروریات اتصاف بالعرض مثل نیت اقتداء سب مقتدیوں کے ذمہ اور ضروریات اعتبار حضور مثل رکوع وسجود وغیرہ دونوں میں مشترک۔

شرح اس معما کی یہ ہے کہ صلوٰۃ کو صلوٰۃ باعتبار عرض معروض معلوم واستماع احکام مقررہ جو قراءت فاتحہ اور قراءت سورۃ میں ہوتا ہے کہتے ہیں اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ لفظ صلوٰۃ بدلالت فقہ اللغۃ اس جانب مشیر

أن النبي ﷺ كان يصلي فذهب جدي يمرّ بين يديه فجعل يتّقيه، أخرجه أبوداود في "السنن" رقم: ٧٠٩. باب سترة الامام سترة من خلفه اور (٢) دوسری روایت یہ ہے: عن ابن عباس قال: أقبلت راكباً على أتان وأنا يومئذ قد ناهزت الاحتلام ورسول الله ﷺ يصلي بالناس بمنىٰ فمررت بين يدي بعض الصف، فنزلت فأرسلت الأتان ترتع ودخلت في الصف فلم ينكر ذلك أحد، رواه ابوداود في "السنن" رقم: ٧١٥، باب من قال الحمار لايقطع الصلاة.

ہے کہ دعائے لسانی مقصود ہے۔

دوسرے جیسے قوت باصرہ وغیرہ قویٰ کو دیکھنے سننے وغیرہ کے لیے بنایا اوراس لیے یہ اموران قویٰ کے حق میں طبعی ہیں ایسے ہی بدلالت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ؀ نفوس انسانی کوعبادت کے لیے بنایا اوراس وجہ سے عبادت اُن کے حق میں ایک خواہش طبعی ہوگی مگر چونکہ طاعت وعبادت اس کو کہتے ہیں کہ مطاع ومعبود کے موافق مرضی کیا کرے، مگراس کی مرضی کا جاننا اُسی کے بتانے پر موقوف ہے اس لیے بالضرور بحکم شوق عبادت خدا تعالیٰ سے استدعاء ہدایت ضروری ہوئی، سواصل میں اسی استدعا اوراس استدعاء کے جواب کی استماع کے لیے یہ افضل العبادات یعنی نماز مقرر ہوئی۔

قیام کا اس کے لیے موضوع ہونا تو خود ہی ظاہر ہے، رہا رکوع وسجود اگر نظر سرسری سے دیکھئے تو یہ بھی مثل سبحانك اللّٰهم اس کے ملحقات میں سے ہیں اگر سبحانك اللّٰهم بمنزلہ سلام دربار ہے تو رکوع وسجود مثل آداب ونیاز وقت انعام ہیں یعنی جب سوال اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ؀ کے بعد سورت پڑھی گئی تو بدلالت ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ؀ یہ معلوم ہوا کہ سائل کا سوال پورا ہوا اوراُس کی امید برآئی اس لیے اس انعام کے شکریہ میں آداب ونیاز بجالانا اُس کے ذمہ ضروری ہوا۔

البتہ اس تقریر کے موافق یہ مناسب تھا کہ سارا قرآن بعد فاتحہ ہر رکعت میں پڑھا جایا کرتا کیونکہ مجموعہ کتاب کی نسبت یہ ارشاد ہے: ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ اور شاید یہی وجہ ہوئی کہ بعض صحابہ نے بعض اوقات ایک رکعت میں سارا قرآن پڑھ لیا تھا، مگر جیسے پانی کے ہر قطرہ کو پانی اور خاک کے ہر ذرہ کو خاک کہتے ہیں، ایسے ہی قرآن کے ہر ٹکڑے کو بشرطیکہ کتاب ہونا یعنی حامل خبر یا طلب ہونا اُس میں پایا جاتا ہو کتاب کہہ سکتے ہیں، اس لیے بغرض تخفیف تھوڑا سا پڑھ لینا جائز رکھا چنانچہ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ بھی اس پر شاہد ہے کہ اصل یہی تھا کہ سب پڑھا جایا کرتا، پر تخفیف کے باعث کمی کی اجازت ہوگئی۔

بالجملہ باعتبار حقیقت نہ وہ از قسم استدعا نہ یہ از قسم دعا، مگر چونکہ بلحاظ عظمت و شان مسئول عنہ سوال کے لیے یہ دونوں ضروری ہیں تو جیسے سامان پُخت و پز ملحق بالطعام ہو جاتے ہیں، چنانچہ اوپر عرض کر چکا ہوں ایسے ہی یہ بھی ملحق بالسوال ہیں۔

اور غور سے دیکھیے تو رکوع و سجود اُن دو حالتوں پر دلالت کرتے ہیں جو بندہ سراپا اطاعت کو وقت سوال و استماع مژدہ انجاح ہونی چاہئیں، یعنی سائل کو اول تو مسئول عنہ کی طرف میلان ضروری ہے اُس میلان ہی پر سوال متفرع ہوتا ہے چنانچہ ظاہر ہے اور بعد استماع مژدہ جان بخش خاص

اُس صورت میں جس میں مطلوب دلی طالب رضائے محبوب ہو انقیاد اور امتثال لازم ہے، اول پر تو رکوع دال ہے چنانچہ اُدھر کو جھکنا اور پھر بعد رکوع سمع الله لمن حمده کہنا اس پر شاہد ہے جھکنا تو خود اس عالم شہادت میں تعبیر میلان ہے اور سمع الله الخ کہنا بے اُس کے موزوں نہیں ہوسکتا کہ رکوع کو سوال حالی کہئے اور انتظار توجہ محبوب کو جس کو استماع سے تعبیر کیا کرتے ہین اُس کے مقتضیات میں سے قرار دیجئے اور ثانی پر سجود دلالت کرتا ہے کیونکہ منقاد کا زیر حکم منقادلہٗ ہونا اس کے تسفل اور اُس کے ترفع اس کے تذلل اُس کے تعزز پر دلالت کرتا ہے، مگر چونکہ میلان فی حد ذاتہٖ ایک امر واحد ہے اور امتثال کی متعدد صورتیں جیسا حکم ہوگا ویسا ہی اُس کا امتثال ہوگا اس لیے رکوع میں وحدت اور سجود میں تعدد مطلوب ہوا۔

یا یوں کہئے کہ اصل انقیاد شوق ہے یا خوف ہے، باعث شوق اگر اسم نافع ہے تو موجب خوف اسم ضار، اس لیے دو سجدے مقرر ہوئے تا کہ اثنینیۃ انواع امتثال پر دلالت کرے۔

بہر حال سوال قالی کے ساتھ سوال حالی بھی جمع کیا گیا تا کہ وہم نفاق پاس نہ آنے پاوے مگر چونکہ سوال حالی گو باعتبار تحقق سوال قالی سے مقدم ہو لیکن ظہور میں اُس سے متاخر، بلکہ اُس کا محتاج تھا اس لیے وہ افعال جو بالطبع مظہر احوال مشارٌ الیہ ہوں وضع میں سوال قالی سے موخر رہے مگر اس صورت

میں نماز کے تمام ارکان کا استدعاء واستماع کے لیے موضوع ہونا زیادہ تر روشن ہوگیا اور یہ بھی روشن ہوگیا کہ افضلیت طول قنوت غلط نہیں اور یہ بھی روشن ہوگیا کہ جیسے ایمان بایں وجہ کہ وہ نیت ایک عام اور عزم انقیاد مطلق ہے تمام اعمال سے افضل ہے حالانکہ ہر عمل میں نیت خاص کا ہونا ضروری ہے ایسے ہی صلوٰۃ بایں وجہ کہ اُس میں استدعا ہدایت مطلقہ اور اظہار امتثال مطلق ہوتا ہے جملہ عبادات سے افضل ہے اور کیوں نہ ہو زکوٰۃ وصوم تو قطع نظر اس سے کہ ایک امتثال خاص ہیں اصل میں عبادت ہی نہیں بوجہ التحاق امتثال امر عبادت بن جاتے ہیں ورنہ لازم آئے کہ خدا تعالیٰ سب میں زیادہ عابد ہو کیونکہ زکوٰۃ میں اصل مقصود داد ودہش [1] ہوتی ہے اور صوم میں اصل مقصود تنزہ، سو ظاہر ہے کہ ان دونوں باتوں میں خدا تعالیٰ سب سے زیادہ ہے، رہا حج اُس کے ارکان اگرچہ مثل ارکان صلوٰۃ باعتبار اصل طبیعت بتوسط محبت انقیاد پر دلالت کرتے ہیں مگر چونکہ اُس کے افعال اصل میں مظہر شیون محبت ہیں تو وہ عموم اور اطلاق عبودیت کہاں جس پر صلوٰۃ دلالت کرتی ہے محبت ہر چند سامان اطاعت ہے مگر اُس کے بعض آثار مثل تنگ دلی وغیرت وغیرہ بسا اوقات بظاہر موہم عدم انقیاد ہو جاتے ہیں۔

علاوہ بریں اصل انقیاد اور واسطۂ انقیاد میں بہت فرق ہے، حج میں

---

(۱) داد ودھش کے معنی: فیاضی وسخاوت۔

واسطہ انقیاد ہے اور نماز میں اصل انقیاد علی ھذا القیاس جہاد وغیرہ طاعات کو خیال فرمالیجئے لیکن درصورتیکہ درباره اعتبار صلوٰۃ جو اصل مقصود من الصلوٰۃ ہے چنانچہ اختصاص واشتہار بنام صلوٰۃ بھی اُس پر شاہد ہے، امام اصل ٹھہرا اور مقتدی اُس کے تابع اور اس سے مستفید تو بحکم اتصاف بالذات ضروریات اعتبار صلوٰۃ یعنی فاتحہ جو ایک عرضی بندگاہ سراپا اخلاص اور استدعائے مطیعان باوفا ہے اور سورت وغیرہ جو حکم نامہ احکم الحاکمین ہے امام ہی کی جانب رہا۔

یہی وجہ ہے جو یہ ارشاد ہوا: وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا ہاں اگر یہ اصلیت وتبعیت نہ ہوتی تو جیسے دو منفرد اگرچہ قریب ہی قریب کیوں نہ ہوں درباره قرأت ایک دوسرے کا کفیل نہیں ہوتا تو یہاں بھی ایک کو دوسرے کا ضامن نہ کہتے اور یہ بھی نہیں تو کبھی اُلٹا تو ہوتا، مگر اس کو کیا کیجئے کہ امام کی قرأت تو سب کے نزدیک ضروری ٹھہری، اس صورت میں تدبیر استماع وانصات بجز اس کے اور کیا ہے کہ مقتدی خاموش رہیں مگر چونکہ اصل وجہ اُس قراءت اور اس استماع وانصات کی وہی اصلیت امام وتبعیت مقتدی ہے تو صلوٰۃ سری بھی اس قصہ میں ہم سنگ صلوٰۃ جہری نظر آتی ہے اسی بناء پر یہ ارشاد ہوا: من کان له امام فقراءة الإمام [1] الخ او کما قال.

(۱) من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة، أخرجه ابن ماجه في "السنن" رقم: ۸۵۰،

باقی ادعیہ التحیات اول تو موضوع لہ صلوٰۃ نہیں فقط مقتضائے کرم ہوا ہے پر یہ بھی اجازت ہوگئی کہ جیسے ہماری مرضی کے موافق دعا کی ہے اپنی مرضی کے موافق سوال کرتے چلو، دوسرے حاجات مخصوصہ میں اختلاف ضروری ہے اس لیے سبھی کو ان کی اجازت ہوگئی علیٰ ہٰذا القیاس بہ نسبت حاجت میت اختلافات خیالات ممکن علاوہ بریں صلوٰۃ جنازہ اپنے لیے دعا نہیں اور کے لیے ہے یعنی از قسم شفاعت ہے اور ظاہر ہے کہ شفاعت میں تکثر اور تعدد زیادہ کارگر ہے اس لیے دعا صلوٰۃ جنازہ میں بھی سب ہی شریک رہے ہیں۔ (۱)

رہی حدیث عبادہؓ (۲) جو وجوب قرأت فاتحہ علی المقتدی پر دلالت کرتی ہے:

اول تو اُس کے ثبوت میں کلام ہے۔

باب اذا قرأ الإمام فانصتوا، والطحاوي في "شرح معاني الآثار" رقم: ۱۲۵۹، باب القراءة خلف الإمام.

(۱) یہ مکمل پیراگراف ''الدلیل المحکم'' میں موجود نہیں ہے۔

(۲) حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ سے دو طرح کی روایات وجوب قرأت فاتحہ علی المقتدی کے باب میں مروی ہیں: (۱) ان میں سے ایک تو لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب، (۲) اور دوسری صلی رسول الله ﷺ الصبح، فثقلت عليه القراءة، فلما انصرف، قال: إني أراكم تقرأون وراء إمامكم؟ قال: قلنا: يارسول الله، إي والله، قال: لاتفعلوا إلا بأم القرآن، فانه لاصلوة لمن لم يقرأ بها، رواه الترمذي في "الجامع" رقم الحديث: ۳۱۱، باب ماجاء في القراءة خلف الإمام.

دوسرے اگر ہے بھی تو حسن ہے صحیح نہیں۔

اور اگر بعض محدثین کی تقلید کیجئے اور صحیح بھی رکھئے تو آیۃ مذکورہ کے معارض نہیں ہوسکتی، اُس کی وجہ ہے مفہوم آیۃ میں تاویل کرنی یا تخصیص کرنی جس کا حاصل وہ نسخ ہے زیبا نہیں اُسی کو آیۃ سے منسوخ کہیں تو زیبا ہے، ہاں! نسخ بے وجہ سے نسخ موجہ زیادہ دل نشین ہوتا ہے اس لیے یہ گذارش ہے کہ جیسے احکام مختلفۃ الماہیات میں تدریج ملحوظ رہی ہے یعنی صلوٰۃ وزکوٰۃ اول فرض ہوئی پھر جہاد، پھر صوم، پھر حج، ایسے ہی ایک ایک حکم کو دیکھئے تو اکثر احکام میں یہی تدریج نکلے گی خاص کر صلوٰۃ، چنانچہ حدیث حضرت معاذؓ[1] بھی جو ابوداود میں دربارہ تحول احوال صلوٰۃ مروی ہے اس پر شاہد ہے اور اول اول سلام وکلام کا جائز ہونا پھر بوجہ نزول قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ اُن کا ممنوع ہونا بھی اسی طرف مشیر ہے۔

سو بعد غور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تعمیر مکان سے پہلے مادہ تعمیر وسامان عمارت یعنی اینٹ، چونا، لکڑی وغیرہ فراہم کیا جاتا ہے اور اُس وقت نہ وہ ترتیب ملحوظ ہوتی ہے جو وقت تعمیر پیش آتی ہے چنانچہ بسا اوقات

---

(۱) وہ یہ حدیث یہ ہے. عن معاذ بن جبل قال: أحيلت الصلاة ثلاثة أحوال، وأحيل الصيام ثلاثة أحوال پھر نصر بن المہاجر (امام ابوداود کے شیخ) نے طویل حدیث بیان کی۔ رواہ ابوداود رقم الحديث: ۵۰۷، باب كيف الأذان.

کڑیاں اور شہتیر اینٹوں اور پتھروں سے پہلے خرید لیتے ہیں اور وہ پتھر اور اینٹیں جو سب سے اوپر لگائی جاتی ہیں سب سے پہلے آجاتی ہیں اور نہ اس وقت فصل بالا جنبی سے کچھ احتراز ہوتا ہے کوئی چیز کہیں پڑی ہے تو کوئی کہیں، پھر بیچ میں سینکڑوں وہ چیزیں ہوتی ہیں جو وقت تعمیر بدستور سابق اُن کا بیچ میں فاصل اور حائل رہنا گوارا نہیں ہوتا ایسے ہی قبل تکمیل کار صلوٰۃ اول مادہ صلوٰۃ یعنی ارکان صلوٰۃ کی تعلیم کی گئی جب ہیئت مجموعی کا زمانہ آیا تو امور اجنبیہ کی ممانعت ہوگئی، مگر جیسے باعتبار طول ایک ہیئت مجموعی ہے ایسے ہی باعتبار عرض یعنی اتحاد صلوٰۃ امام ومقتدی ایک ہیئت مجموعی ہے، سو قبل اہتمام ہیئت مجموعی عرض اول تو یہ حکم تھا ''لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب وسورۃ '' چنانچہ ان شاء اللہ ترمذی وغیرہ کتب حدیث میں یہ روایت ملے گی، اور جب اہتمام ہیئت مشار الیہ شروع ہوا تو مقتدیوں کے ذمہ سے اول تو یہ وجوب سورت ساقط کیا گیا بلکہ امام کو نائب خداوندی قرار دے کر اُسی کے ذمہ یہ بار رکھا کیونکہ اصل غرض ضم سورت سے جواب سوال اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ہے اس لیے سورت منضمہ بمنزلہ حکم نامہ احکم الحاکمین ہے اور چونکہ وہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے تو ایک نائب اس باب میں کافی نظر آیا، البتہ فاتحہ اصل میں عرضی بندگان سراپا اخلاص تھی اور اُن کی کوئی تعداد نہیں تو ایک کا نائب کثیر ہونا کسی قدر دشوار معلوم ہوتا تھا اس لیے

حدیث عبادہؓ میں باستثناء فاتحہ قراءت سے ممانعت فرمائی گئی،

اُس کے بعد بتدریج امام کی نیابت کو ترقی ہوئی بندوں کی طرف سے اس کو نائب بنایا گیا اور کیوں نہ ہو جب خدا کا نائب ہو چکا تو بندوں کی نیابت میں کیا دشواری رہ گئی، اختلاف مطالب ہوتا تو ایک وقت سب کی طرف سے گذارش اور سب کی نیابت دشوار تھی جب معروض واحد اور مطلب سب کا ایک ہے تو پھر کیا دقت رہی، یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ قبلہ اور مقتدیوں کے بیچ میں اُس کو جگہ ملی تا کہ یہ اُس کا بین بین ہونا اُس کے اُس بین بین ہونے پر دلالت کرے جس پر اُس کی نیابت طرفین دلالت کرتی ہے، علاوہ بریں رکوع وسجود وغیرہ ارکان میں امام کا شریک مقتدی ہونا نیابت عباد کو زیادہ مصحح ہے اس وقت حدیث من کان له امام [1] وغیرہ اور آیۃ واذا قرئ القرآن کا نمبر معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم مگر اس عروج کے بعد جس پر نیابت خداوندی دلالت کرتی ہے یہ نزول جو مقتضائے نیابت عباد ہے بعینہٖ ایسا ہے جیسا رسول اول نائب خدا ہو کر آتا ہے، یہاں اگر حسب استدعا امت کچھ عرض کرتا ہے تو ادھر کی نیابت کا کام کرتا ہے

اور یا یوں کہئے کہ سورۃ منضمہ تو ایک خدائے واحد کا پروانہ ہے پر فاتحہ ہر ہر واحد کی عرضی ہے علاوہ بریں بوجہ اشتمال مضامین حمد وثنا سبحنك سے

(۱) اس حدیث کی تخریج ماقبل میں گذر چکی ہے۔

زیادہ تر مشابہ، سو اگر یہ خیال کیجئے کہ بطور معروضات رعیت ایک شخص سب کی طرف سے معروض معلوم عرض کر لے گا تو اشتمال مذکور اور تعدد اہل عرض کا بھی خیال چاہئے اور ظاہر ہے کہ بخیال اشتمال مذکور و خیال تعدد اہل عرض ہر ایک کا فاتحہ پڑھنا مناسب نظر آتا ہے۔

ادھر یہ حکم آچکا تھا کہ لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب اور در بارہ مقتدی تصریح کچھ ہوئی نہ تھی اس لیے مقتضائے احتیاط نبوی یہ ہوا کہ تا صدور حکم مصرح مقتدیوں کو فاتحہ کا ارشاد کیا جائے اس لیے بیان وجہ استثناء کے لیے بطورِ احتیاط حدیث عبادہؓ میں یہ فرمایا فانہ لا صلوٰۃ الخ او کما قال۔

ان دونوں توجیہوں میں سے جونسی جس کسی کو پسند آئے اُس کو اختیار ہے، پر توجیہ اخیر احکام دین کے حق میں زیادہ تر مناسب ہے کیونکہ اس صورت میں احکام اصلیہ میں تعارض نہ ہوگا اگر ہوگا تو احکام احتیاطیہ میں ہوگا اور اس لیے خدا کی طرف سے نسخ کی نوبت ہی نہ آئے گی جو یہ خدشہ ہو کہ نسخ گو جائز ہو پر خلافِ اصل ہے تا مقدور اُس سے احتراز مناسب ہے۔

مگر ہر چہ باداباد اس طور سے رکھئے تو ہر ایک حکم بجائے خود موجہ ہو جاتا ہے اور نسخ موزوں نظر آتا ہے ورنہ بمقابلہ آیۃ مذکورہ یہ حدیث تو کیا فقط جملہ لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب بھی لائق امتثال نہیں، یہ مطلب نہیں کہ احادیث صحیحہ معارض قرآن ہوتی ہیں بلکہ اختلاف زمان سے اگر قطع

نظر کیجئے تو یہ ممکن عادی نہیں کہ زمانۂ حکم واحد ہو اور پھر حدیث صحیح معارض قرآن ہو بلکہ غرض یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ حدیث بھی معارض ہوتی تو یہ بھی بمقابلہ قرآن شریف واجب الترک تھی مگر اس کو کیا کیجئے کہ یہ حدیث اصلاً معارض نہیں۔

حاصل منطوق حدیث مذکور یہ ہے کہ ایک صلوٰۃ کے لیے ایک فاتحہ چاہئے سو باعتبار طول ایک رکعت ایک صلوٰۃ ہے ہر رکعت میں فاتحہ ضروری ہوئی، اور باعتبار عرض صلوٰۃ امام و مقتدی واحد ہے یہاں بھی ایک ہی فاتحہ کافی ہوگی۔

الغرض احادیث مذکورہ میں سے حدیث عبادۃ گو باعتبار منطوق قرآن سے متعارض ہو مگر بوجہ اختلاف زمان جس پر شہادت فطرت سلیمہ موجود ہے تعارض نہیں، کیونکہ تعارض کے لیے وحدت زمان بھی ضروری ہے جو من جملہ ہشت وحدات تناقض [1] ہے، اور حدیث لا صلٰوۃ الا بفاتحۃ الکتاب میں باعتبار منطوق بھی تعارض نہیں، گو اہل ظاہر کو معلوم ہوتا ہو، البتہ تعارض فاقرء وا کا کھٹکا ہنوز باقی ہے، اُس کی مدافعت کے لیے یہ گذارش ہے کہ قرأت باعتبار صلوٰۃ مطلوب ہے اور بحکم بعض مقدمات معروضہ ضروریات

---

(۱) در تناقض ہشت وحدت شرط داں — وحدت موضوع و محمول و مکاں
وحدت شرط و اضافت جزو کل — قوت و فعل است در آخر زماں

صلوٰۃ کی ضرورت مصلی بالذات اور اس وصف کے موصوف بالذات کو ہوگی اس لیے مخاطب فاقرء وا سوائے امام ومنفرد اور کوئی نہیں ہوسکتا اور کیونکر ہوں بدلالت سیاق وسباق مخاطب فاقرء وا مصلی ہیں اور اطلاق مصلّی موصوف بالذات بالصلوٰۃ پر تو حقیقی ہے اور موصوف بالعرض پر مجازی، کیونکہ وہ واقع میں موصوف (مصلی) ہی نہیں ہوتا اس صورت میں خطابِ فاقرء وا میں مقتدی داخل ہی نہ ہوں گے جو اخراج کی ضرورت پڑے بلکہ مدرکِ رکوع کا بالاجماع اس حکم سے سبکدوش ہونا اسی کی تفسیر ہے کہ مقتدی حقیقت میں مصلی ہی نہیں اور اس لیے فاقرء وا کے مخاطب فقط امام ومنفرد ہیں مقتدی نہیں۔

اور یہی وجہ ہوئی کہ قیام اس پر فرض نہ ہوا کیونکہ قیام بوجہ قرأت مطلوب تھا، جب قرأت ہی اُس کے ذمہ نہیں اور نہ وہ حکم قرأت کا مخاطب تو پھر مطالبہ قیام بے سود ہے، (باقی وجوب قیام رکعات باقیہ بحکمِ حضور ہے نہ بحکم صلوٰۃ)[1] اس کے بعد اس تاویل کی کچھ حاجت نہیں کہ للاکثر حکم الکل تین فرضوں میں سے دو کا ادا ہو جانا بھی کافی ہے، علاوہ بریں اگر یہ عذر قابل استماع ہو تو قیام اور رکوع وسجدہ واحد بھی کافی ہوا کرے، علیٰ ہذا القیاس قیام اور دو سجدوں سے نماز ہو جایا کرے اس وقت نہ دونوں

(۱) بین القوسین میں دی گئی عبارت ''الدلیل المحکم'' سے نقل کی گئی ہے، توثیق الکلام میں نہیں ہے۔

آیتوں میں تعارض باقی رہتا ہے اور نہ اعتراض ظنیت حدیث، بوجہ تخصیص دربارہ فرضیت قرأت علی الامام والمنفرد قادح ہوسکتا ہے، اگرچہ جواب اعتراض مذکور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آیۃ فاقرء وا دربارہ قرأت خاص ہے اور عموم وخصوص بعض، اگر ہے تو باعتبار مخاطبین ہے اس لیے اگر قطعیت مبدل بظنیت ہوگی تو دربارہ تعین مخاطبین ہوگی نہ درباب قرأت، پر جیسے بدلالت حدیث صید جس میں احتیاط پر نظر کر کے اُس صید کو حرام کردیا ہے جس کے اصطیاد میں اَور کتا بھی شریک ہوجائے [1] ایسے ہی بوجہ احتیاط اُن لوگوں پر قرأت فرض رہے گی جن کا حکم قرأت سے خارج ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں ہوا اگر حرمت مستحق احتیاط ہے تو فرضیت بھی یہ استحقاق رکھتی ہے۔

بالجملہ نہ آیۃ فاقرء وا اور آیۃ اذا قرئ القرآن میں تعارض ہے اور نہ حدیث لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب وغیرہ احادیث دالہ علی وجوب قرأت الفاتحہ اور آیۃ میں تعارض ہے، ہاں! البتہ حدیث عبادۃ اور آیۃ اذا قرئ القرآن میں باعتبار منطوق تعارض ہے، پر بلحاظ اشارات مذکورہ حدیث مذکور کا تقدم اور آیۃ کا تاخر بہ نسبت تقدم آیۃ وتاخر حدیث زیادہ تر چسپاں ہے۔

پھر اس پر حدیث کی صحت میں کلام ادھر قائلان وجوب قرأت فاتحہ علی المقتدی کو دیکھا کہ فکر تعمیل آیۃ سے غافل نہیں، صحابہ کرام میں حضرت

(۱) یعنی کلب معلَّم کے ساتھ دوسرا کتا بھی شریک ہوجائے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ائمہ فقہ میں حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کو ایجاب فاتحہ علی المقتدی میں زیادہ تشدد ہے، مگر حضرت ابو ہریرہؓ تو تتبع سکتات امام کا ارشاد فرماتے ہیں اور حضرت امام شافعی کے مقلدوں کو دیکھا کہ امام بعد فاتحہ دیر تک ساکت کھڑا رہتا ہے اُس وقت مقتدی فاتحہ پڑھتے ہیں سوا اس کے کہ تتبع سکتات امام اور سکتہ طویلہ بین الفاتحہ والسورۃ کو ایک تجویز اضطراری کہئے اور کیا کہئے حدیثوں میں مرفوعاً تو شاید کہیں یہ دونوں باتیں نہ ہوں، اگر یہ تجویز بلحاظ آیۃ مذکورہ نہیں تو اور کیا ہے جس صورت میں آیۃ مذکورہ قائلان وجوب فاتحہ علی المقتدی کے نزدیک بھی واجب التعمیل ٹھہرے اور خود اُن کی تجویز غیر مروی تو اس صورت میں یہی بہتر نظر آتا ہے کہ حدیث من صلی [1] الخ وغیرہ کی طرف رجوع کیا جائے اوروں کی تجویز سے تو اُس کی تعمیل بہتر ہی ہوگی، اور کیوں نہ ہو اول تو اُس بارہ میں احادیث مرفوع الاسناد اور بھی موجود ہیں چنانچہ امام محمدؒ کی موطا میں موجود ہیں، اور اگر اسی روایت پر قناعت کی جاوے اور اُس سے قطع نظر کی جاوے کہ قوت درایت، قوت روایت سے مقدم ہے چنانچہ ان شاء اللہ تعالیٰ واضح ہو جائے گا، موقوفاً تو اُس کی صحت میں کلام ہی نہیں، پھر باوجود اشتہار نص لا صلوٰۃ

(۱) مکمل حدیث یہ ہے: عن جابر بن عبداللہ عن النبی ﷺ من صلی خلف الامام فان قراءۃ الامام لہ قراءۃ. (موطا امام محمد ج ا ص ۴۱۶)

الا بفاتحة الکتاب حضرت جابرؓ کا یہ ارشاد ہے اس کے متصور ہی نہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے سنا ہو احتمال اجتہاد ہے تاویلات رکیکہ چسپاں نہیں ایسی حدیث موقوف بھی مرفوع کے حکم میں ہے، علاوہ بریں امر اگر اجتہادی تھا تو ایسا تھا کہ باب زر باید نوشت یعنی جب امام دربارہ صلوٰۃ موصوف بالذات ہو تو پھر مقتدی پر بار قرأت بے موقع نظر آیا اور اُس کے ساتھ آیۃ اذا قرئ القرآن کو مانع قرأت دیکھا اور آیۃ فاقرءوا کو اُس کے موافق پایا مخالف نہ پایا اور حدیث عبادہؓ کو بوجہ تدریج مشار الیہ مجملہ احکام سابقہ سمجھا ان سب باتوں کے لحاظ کے بعد اس اجتہاد کو غلط کہنا مناسب نہیں، ہاں! کسی نص کا تعارض ایسا ہوتا کہ اُس کی مدافعت کی کوئی صورت ہی نہ ہوتی تو البتہ محل تامل تھا اس وقت تو غور سے دیکھئے تو حدیث عبادہ اور آیۃ اذا قرئ القرآن کا تعارض ایسا ہے کہ بے تجویز تتبع سکتات یا سکتہ طویلہ مشار الیہا اُس کی مدافعت کی کوئی تدبیر نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں تجویزیں غیر مروی۔

باقی روایت مرفوع اُس کے کسی طریقہ میں کلام ہے تو ایسے کلام تو حدیث عبادہؓ میں بھی موجود ہے، محمد بن اسحٰق کی تعدیل اگر کسی نے کی تو اُن کا کہا قول فیصل نہیں ہوسکتا، روایت کا حال اول تو مشاہدۂ افعال سے منتزع ہوتا ہے اُس میں اختلاف ہو تو وہ درحقیقت اختلاف انتزاع ہے، اور

تعارض ظن وتخمین ہے اگر مراتب انتزاع میں سب برابر ہیں تو بشرطِ تساوی مشاہدہ اعتبار میں بھی سب برابر ہوں گے ان کے بعد جو کوئی کہے گا اُنہیں کے حوالے سے کہے گا، جس کسی کو متاخرین میں سے منجملہ ائمہ جرح وتعدیل کسی کا اعتقاد زیادہ ہوا اُس نے اُسی کا اتباع کیا، ایک کا اعتقاد دوسرے کے حق میں واجب اللحاظ نہیں جو اُس کا قول فیصل سمجھا جائے۔ یہ بات درایت میں متصور ہے یعنی اگر کسی نے بنائے احکام کا پتہ لگا دیا جیسا بشرط انصاف اوراق معروضہ میں ہوا ہے تو پھر ہر حکم ٹھکانے لگ جاتا ہے اور اس لیے اُس کا قول ''قول فیصل'' ہو جاتا ہے پھر اگر حدیث عبادہؓ اور طرق سے مروی ہے تو حدیث من صلی بھی باللفظ یا بالمعنی اور طرق سے مروی ہے، امام محمدؒ کی موطا کو مطالعہ فرمایئے گا اُس میں بعض طرق ایسے بھی نکلیں گے ان شاء اللہ کہ علیٰ شرط الشیخین ہوں (۱) اور یہ بات سراسر تعصب اور ناانصافی کی ہے کہ امام محمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا روایت میں اعتبار ہی نہ کیا جائے اگر روایت میں فقہاء کا اعتبار نہیں تو اوروں کا بدرجۂ اولیٰ نہ ہوگا (۱)، کیا کیجیے اس ویرانہ

(۱) التعلیق الممجد (ج ا ص ۴۱۶) میں علامہ عبدالحی لکھنویؒ نے حدیث جابر بن عبداللہ من صلی خلف الامام فان قراءة الامام له قراءة کے نقل کرنے کے بعد چھ صحابہؓ سے الگ الگ سند سے یہ روایت ذکر کی ہے۔ (ملاحظہ ہو: التعلیق الممجد ج ا ص ۴۱۶-۴۱۸)

(۱) جیسے امام ترمذیؒ نے اپنی "الجامع الکبیر" میں "باب غسل المیت" کے تحت حدیث ام

عطیہؒ پر کلام نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے:وكذلك قال الفقهاء، وهم أعلم بمعاني الحديث.

اور امام خطابیؒ معالم السنن (ج۱ص۵) میں لکھتے ہیں: "ورأيت أهل العلم في زماننا، قد انقسموا الى فرقتين: أصحاب حديث وأثر، وأهل فقهٍ ونظر، وكل واحدة منهما لاتتميّز عن أختها في الحاجة، ولاتستغني عنها في درك ماتنحوه من البغية والإرادة، لأن الحديث بمنزلة الأساس الذي هو الأصل، والفقه بمنزلة البناء الذي هو كالفرع، وكل بناء لم يوضع على قاعدة وأساسٍ فهو منهار، وكل أساسٍ خلا عن بناءٍ وعمارة فهو قفر وخراب".

وذكر الخطيب في الكفاية بعض مرجحات الأخبار، وقال: ويرجّح بأن يكون رواته فقهاء، لأن عناية الفقيه بما يتعلق من الأحكام أشدّ من عناية غيره بذلك، وساق قصة وكيع المذكورة، وزاد قول وكيع في آخرها: وحديث تداوله الفقهاء خير من أن يتداوله الشيوخ، وعن وكيع أنه قال: حديث الفقهاء أحبّ اليّ من حديث الشيوخ.

اسی طرح کتاب الثقات ج۸ص۴۶۷ میں ابن حبان نے، الکامل ج۷ص۲۴۷۴ میں ابن عدی نے، اور جامع بيان العلم وفضله ج۲ص۱۳۰-۱۳۱ میں ابن عبد البر نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ امام اعمشؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے پوچھا کہ اے نعمان! آپ فلاں مسئلہ کے بارے میں کیا کہتے ہیں تو امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: کذا و کذا... تو اعمش نے فرمایا: اس بات کا ثبوت آپ کس روایت سے پیش کرتے ہیں؟ تو امام صاحبؒ نے فرمایا: آپ سے ہی میں نے فلاں حدیث نقل کی تھی تو اعمش نے کہا: "يا معشر الفقهاء أنتم الأطباء ونحن الصيادلة".

وقال ابن حبان في مقدمة "صحيحه" ما ملخصه: "وأما زيادة الألفاظ في الروايات فانا لانقبل شيئا منها الا عن من كان الغالب عليه الفقه، لأن أصحاب الحديث الغالب عليهم حفظ الأسامي والأسانيد دون المتون، فاذا رفع محدث خبراً

وكـان الـغـالـب عـليـه الفقه لم أقبل رفعه الا من كتابه، وكذلك لا أقبل عن صاحب حـديـث حـافـظ متـقـن أتى بزيادة لفظه في الخبر، لأن الغالب عليه إحكام الاسناد، وحـفـظ الأسـامـي، والاغـضـاء عن المتون وما فيها من الألفاظ الا من كتابه، هذا هو الاحتياط في قبول الزيادات في الألفاظ".

وقـالّ ابن وهب: كل صاحب حديث ليس له إمام في الفقه فهو ضالّ، ولولا أن الله أنقذنا بمالك والليث لضللنا. (اثر الحديث الشريف از محمد عوامه ص۸۳)

وقـال ابـن أبـي حـاتم في الجرح والتعديل (ج۱ ص۲۵) : كان حديث الفقهاء أحبّ اليهم من حديث المشيخة.

علامہ عراقیؒ نے ''التقیید والایضاح'' (ص۲۷۲-۲۷۴) چھتیسویں نوع میں روایت کی ایک سودس وجوہِ ترجیحات ذکر کی ہیں، جن میں سے ابتدائی پچاس وجوہ علامہ حازمیؒ نے اپنی کتاب ''الاعتبار'' میں نقل کی ہیں ان میں سے تیسویں (۲۳) نمبر پر ہے: کونه فقیهاً کہ راوی فقیہ ہو۔

وقـال سفيان الثوري: كنا بين يدي أبي حنيفة كالعصافير بين يدي البازى، وان أبا حنيفة سيد العلماء. (تنسيق النظام ص۸)

وقـال يحيى بن آدم -أحد شيوخ البخاري في "صحيحه"-: إن في الحديث ناسخاً ومنسوخاً كما في القرآن، وكان النعمان - أبوحنيفة- جمع حديث أهل بلده كله، فنظر الى آخر ما قبض عليه النبي ﷺ فأخذ به فكان بذلك فقيها. (أثر الحديث ص۱۵۹)

وقـال الـكـاسـانـي فـي شـأن الإمام الأعظم أبي حنيفة رحمه الله: انه كان من صيـارفة الحديث، وكان من مذهبه تقديم الخبر وإن كان في حدّ الأحاد على القياس بعد أن كان راويه عدلاً ظاهر العدالة. (مكانة الإمام أبي حنيفة ص۵۸)

وقال ابن حجر في فتح الباري في باب النهي للبائع أن لايحفل من كتاب البيوع: وقد ترك أبوحنيفة القياس الجلي لرواية أبي هريرة وأمثاله كما في الوضوء بنبيذ التمر ومن القهقهة في الصلاة. (هكذا قاله ابن تيمية في مجموعة الفتاوى ٢٠/٣٠٤)

عبداللہ بن داود الخریبی کہتے ہیں: ''يجب على أهل الاسلام أن يدعوا الله تعالى لأبي حنيفة في صلاتهم'' (مقدمہ اعلاء السنن ص ۳۰۹)

اور امام عبداللہ بن المبارکؒ کا قول پڑھئے اور امام ابوحنیفہؒ کی فقاہت کا اندازہ لگائیے فرماتے ہیں: ''لو لا أن الله أعانني بأبي حنيفة وسفيان كنتُ كسائر الناس'' (مقدمہ اعلاء السنن ص ۳۱۰، ۳۱۱)

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے الرفع والتكميل في الجرح والتعديل کے ص ۹۱ کے حاشیہ میں ملا علی قاریؒ کے رسالہ "أدلة معتقد أبي حنيفة الامام، في أبوي الرسول عليه الصلاة والسلام" ص ۴۲ کے حوالہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: "وقال الأقدمون: المحدث بلا فقه كعطّارٍ غير طبيب، فالأدوية حاصلة في دكانه، ولايدرى لما ذا تصلح، والفقه بلاحديث كطبيب ليس بعطار، يعرف ماتصلح له الأدوية، إلا أنها ليست عنده".

مذکورہ بالا اقوال سے معلوم ہوگیا کہ فقہاء کی روایت کا کیا مقام ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ تو فقہاء کے سردار تھے تو کیسے ان کی روایت کو رد کیا جاسکتا ہے۔

اور جہاں تک امام صاحب کا نقل حدیث کا اصول ہے وہ یہ ہے کہ امام صاحب کے نزدیک روایت بالمعنی جائز نہیں ہے جیسے کہ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں: "قال أبوحنيفة: لاينبغي للرجل أن يحدث من الحديث إلا مايحفظه من يوم سمعه إلى يوم يحدث به" (شرح مسند الإمام أبي حنيفة از ملا علی قاریؒ ص ۷)

میں مواد کتب حدیث کا بالکل پتہ نہیں اور دیوبند اور سہارن پور میں اگر بعض کتابیں ہوں بھی تو یہاں سے دور، علاوہ بریں کچھ بوجہ تواتر امراض، ناتوانی، کچھ قدیم کی تن آسانی کتاب دیکھنی ایک موت ہے ورنہ اس باب میں بھی کچھ لکھتا، بناچاری اپنے ہی خیالات پر اکتفاء کرتا ہوں میرے احباب تو بوجہ حسن ظن ومحبت تحقیقات دانش مندانہ سمجھیں گے پر اور لوگ

اور باقی رہا مخالفین کا پروپیگنڈہ کہ امام صاحبؒ کو سترہ حدیثیں یاد تھیں یا اس طرح کی اور باتیں، تو یاد رکھئے! یہ سب مبنی بر تعصب ہے، حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب نقل حدیث میں جتنے محتاط ہیں اس کا اندازہ آپ نے امام صاحبؒ کے مذکورہ بالا قول سے لگالیا ہوگا۔ کتاب الآثار اور امام صاحب کی تمام مسانید اس بات پر دال ہیں کہ امام صاحب حفاظِ حدیث میں سے ہیں، علامہ ذہبیؒ نے امام صاحب کا ذکر "تذکرۃ الحفاظ" میں کیا ہے، اور یاد رکھئے! امام صاحبؒ کی تصنیف "کتاب الآثار" کو ہی یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ احادیث صحیحہ کا ابوابِ فقہیہ پر مرتب اولین مجموعہ ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: امام ابن ماجہ اور علم حدیث از محقق العصر علامہ محمد عبدالرشید نعمانیؒ ص ۱۵۸) اور امام صاحب واحد شخصیت ہیں جن کی کتاب الآثار ومسانید کے رواۃ وجامعین کی تعداد ۲۸ کے لگ بھگ ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: مسانيد الإمام أبي حنيفة از حضرت مولانا محمد امین اورکزئی ص ۷۷) ان مسانید میں کچھ مطبوع ہیں اور کچھ غیر مطبوع۔

ان مسانید میں کئی روایات امام صاحبؒ کی ثنائیات بھی ہیں جو جناب عبدالعزیز یحییٰ السعدی (فاضل دار العلوم کراچی، متخصص فی الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوریؒ ٹاؤن واستاذ دار العلوم زاہدان ایران) نے "الإمام الأعظم أبو حنيفة والثنائيات في مسانيده" کے نام سے جمع کی ہیں جن کی تعداد ۲۱۹ ہے اور دار الکتب العلمیۃ (بیروت) سے طبع ہوچکی ہے۔

اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ صرف فقہ میں ہی امام نہیں بلکہ حدیث کے بھی امام تھے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

شاید ان خیالات کو خیالات شاعرانہ سمجھیں اس لیے لکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا، مگر دنیا بامید قائم یوں سمجھ کر کہ شاید آپ کو یہ مشرب موافق مزاج نظر آئے کچھ تو لکھ چکا ہوں اور کچھ اور لکھتا ہوں:

سنئے! شاید تقریرات گذشتہ کو سن کر کسی کو یہ خیال ہو کہ اگر امام موصوف بالذات ہے اور اس وجہ سے امام اور مقتدیوں کی نماز واحد ہے تو مقتدی کے ذمہ طہارت اور ستر عورت اور استقبال قبلہ اور رکوع و سجود بھی نہ ہونا چاہئے یہ بار بھی امام ہی کے سر رہا ہوتا ادھر سبحانک اور تسبیحات اور التحیات اور درود ودعا اور تکبیر و تسلیم بھی جس درجہ میں مطلوب ہیں اُسی سے مطلوب ہوتیں اس لیے یہ گذارش ہے کہ عروض وصف کے لیے یہ ضروری ہے کہ معروض یعنی موصوف بالعرض احاطہ موصوف بالذات سے خارج نہ ہو دریا میں بھی کہیں ہونا استفادہ حرکت سفینہ کے لیے کافی نہیں اُسی کے احاطہ میں ہونا ضروری ہے، شعاعوں کے نور سے مستفید ہونے کے لیے بُعد مجرد میں سے کیف ما اتفق کہیں رہنا کافی نہیں، اُنہیں کے احاطہ میں رہنا ضروری ہے، ایسے ہی امام سے استفادہ صلوٰۃ کے لیے کہیں ہونا کافی نہیں اُسی کے احاطہ صلوٰۃ میں ہونا ضروری ہے مگر امام کے ہر قول و فعل سے نمایاں ہے کہ وہ بقدر وسعت حال ادھر سے غائب ہو گیا اور خدا کی درگاہ بے نہایت میں حاضر ہے خطاب سبحانک اور سوال اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ اور

دست بستہ کھڑا ہونا، پھر کبھی جھکنا اور کبھی سر رکھ دینا بدرجہ کمال اس حضور پر دال ہیں، یہی وجہ ہے کہ اختتام صلوٰۃ پر سلام کو رکھا گیا، کیونکہ انقطاع غیبت فی الجملہ پر جب سلام مسنون ہوا تو اس غَیبتِ کبریٰ کے انقطاع کے بعد سلام کیوں نہ مشروع ہوگا اس سے زیادہ اور کون سی غَیبت ہوگی کہ عالم امکان سے غائب ہوکر عالم وجوب میں پہنچا۔

بالجملہ امام وقت نماز دربارِ خداوندی میں حاضر ہوتا ہے اس صورت میں کسی حال میں کہیں ہونا تو کیا اُس درگاہ بے نہایت میں بھی امام سے علیحدہ ہوکر حاضر ہونا کافی نہیں ہے وہ درگاہ تو بے نہایت ہے دریا سب متناہی ہیں جب اُن میں خارج از احاطہ سفینہ ہونا کافی نہیں تو بارگاہ غیر محدود ربّ معبود میں کہیں ہونا کیا نافع ہوگا اُسی کے احاطہ میں اور اُسی کے ساتھ ہونا چاہیئے یہی وجہ ہوئی کہ نیت اقتداء ضروری ہے یعنی بمقتضائے اتصاف بالعرض نیت اقتداء مقتدی کے ذمہ ضروری ہے۔

اس صورت میں مقتدی کو بھی حضور دربارِ خداوند عالم ضروری ہے مگر حضور دربار حکام مجازی اور شاہان دنیا کو یہ لازم ہے کہ حاضر ہونے والا نہا دھو کے لباس درست کر کے وہاں پہنچے تو منہ اُدھر کو ہو آداب دربار بجالائے حاضران دربار خداوندی کے ذمے یہ کیوں نہ ہوگا کہ پہلے پاک صاف ہو لے لباس مناسب پہنے پہنچے تو روئے نیاز اُدھر کو رہے اپنے اپنے موقع پر

آداب مناسب بجالائے۔

الغرض یہ امور جو مقتدی کے ذمہ واجب ہیں تو بمقتضائے وصف صلوٰۃ نہیں ورنہ لازم تھا کہ بمقتضائے حکم لا صلوٰۃ اول سے آخر تک سوائے فاتحہ کچھ نہ پڑھا جاتا، بلکہ وجوب علی المقتدی یا استحباب بمقتضائے وصف حضور ہے اور میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ دونوں اعتبار متغایر ہیں گو ایک ہی مصداق پر عارض ہوں اور اگر یہ خیال کیا جائے کہ اصل صلوٰۃ وقرأت معہودہ ہے اور رکوع وسجود وغیرہ ملحق بالصلوٰۃ ہے تو اتحاد مصداق بھی نہیں رہتا۔

الحاصل یہ دونوں اعتبار متغایر ہیں اور ہر ایک کے آثار اور مقتضیات جدا جدا، چونکہ حضور میں دونوں برابر ہیں تو اُس کے آثار بھی مشترک رہیں گے اور صلوٰۃ میں امام منفرد ہے تو قرأت جو اُس کے مقتضیات میں سے ہے امام ہی کے ساتھ خاص رہے گی اور نیت اقتداء جو مقتضیات استفادہ اور اتصاف بالعرض میں سے ہے مقتدی کے ساتھ مخصوص رہے گی اور چونکہ موصوف بالذات کو معروضات سے استغناء لازم ہے تو اُس کے ذمے نیت امامت نہ ہوئی۔

اور اُس وقت یہ استبعاد بھی مندفع ہو جائے گا کہ سبحانک اور تسبیحات اور التحیات تو مقتدی کے ذمہ رہیں حالانکہ فی حد ذاتہٖ چنداں ضروری نہیں اور قرأت جو بمقتضائے آیۃ فاقرء وا ضروری ہے بالخصوص فاتحہ جس کی

ضرورت پر نص قاطع لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب موجود ہے اُس کے ذمہ نہ رہے اور عام طور پر اس مضمون کو بیان کیجئے تو پھر اُس کی یہ صورت ہے کہ آداب دربار اور سلام تو سبھی حاضران دربار بجالایا کرتے ہیں پر عرض مطلب کے وقت اور استماع جواب کے لیے کوئی ایک ہی آگے بڑھا کرتا ہے اور کسی لائق ہی کو آگے بڑھایا کرتے ہیں، اسی طرح اگر سبحانک اور تسبیحات اور التحیات اور تکبیرات سب بجالائیں اور قرأت جو درحقیقت عرض مطلب ہے یا اُدھر کا جواب فقط امام ہی کے ذمے رہے تو کیا بے جا ہے اس صورت میں بھی امام کی افضلیت کے محمود اور مطلوب ہونے کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے اس سب گذارش کے بعد یہ گذارش ہے کہ حسب ارشاد فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ترک قرأت خلف الامام قرأۃ فاتحہ سے خیر اور احسن معلوم ہوتا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہم سے کم فہموں کو جتنا ترک قرأت قواعد مقررہ شرع پر منطبق معلوم ہوتا ہے اتنا قرأۃ خلف الامام کو منطبق نہیں پاتے، البتہ حامیان قرأۃ خلف الامام اس باب میں اگر بول سکتے ہیں تو اتنا ہی بول سکتے ہیں کہ روایت قرأۃ فاتحہ روایات ترک قرأت فاتحہ سے اقویٰ ہے، مگر اول تو یہ دعویٰ غیر مسلّم، اہل انصاف تو عجب نہیں کہ اس بات کو تسلیم

نہ کریں اور اگر بالفرض اس بات کو تسلیم ہی کیجئے تو اُس کو عمل بالاحوط کہنا چاہئے، از قسم ردوا الی اللہ والرسول نہیں اور ظاہر ہے کہ عمل بالاحتیاط اُسی وقت تک ہے جب تک حقیقت حال معلوم نہ ہو اگر حقیقت الامر منکشف ہو جائے تو پھر احتیاط کے لیے موقع ہی نہیں رہتا، اس جا سے یوں ہی سمجھ میں آتا ہے کہ قوت روایت باعتبار درایت قوت سند سے بڑھ کر ہے یہی وجہ معلوم ہوتی ہے فقہاء کا سند میں زیادہ اعتبار ہوا اور کیوں نہ ہو روایت بالمعنی اکثر ہوتی ہے اور اُس میں فہم ہی کی زیادہ ضرورت ہے۔

بالجملہ باعتبار درایت نسخ قرأت مقتدی زیادہ موجہ ہے پھر اُس پر تعارض آیت واذا قرئ القرآن الخ سے قوت باعتبار سند بھی تارکانِ قرأت ہی کی طرف رہی، اس پر بھی امام ابوحنیفہ پر طعن کئے جائیں اور تارکانِ قرأت پر عدم جواز صلوٰۃ کا الزام ہوا کرے تو کیا کیجئے زبانِ قلم کے آگے کوئی آڑ نہیں، دیوار نہیں، پہاڑ نہیں۔

ہم کو دیکھئے باوجود توجیہات مذکورہ اور استماع تشنیعات معلومہ فاتحہ پڑھنے والوں سے دست و گریبان نہیں ہوتے بلکہ یوں سمجھ کر کہ ہم تو کس حساب میں ہیں امام اعظم بھی باوجود عظمت و شان امکان خطا سے منزہ نہیں، کیا عجب ہے کہ امام شافعی علیہ الرحمۃ ہی صحیح فرماتے ہوں اور ہم ہنوز اُن کے قول کی وجہ کو نہ سمجھے ہوں اس امر میں زیادہ تعصب کو پسند نہیں

کرتے، پر جس وقت امام علیہ الرحمۃ کی توہین سنی جاتی ہے دل جل کر خاک ہو جاتا ہے اور یوں جی میں آتا ہے کہ ان زبان درازیوں کے مقابلہ میں ہم بھی لن ترانیوں (۱) پر آجائیں اور دو چار ہم بھی سنائیں پر آیت وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۞ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۞ اور احادیث منع نزاع مانع ہیں۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین

تمام شد

(۱) لن ترانی: ڈینگیں مارنا، شیخیاں۔

جواب حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحبؒ کا در باب تقلید وتراویح آٹھ رکعت اور پڑھنا ضاد کا مخرج ظاء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدمت میں علماء دین کی عرض ہے کہ ایک شخص کوہ لنڈہورہ پرگنہ ضلع بجنور کا رہنے والا آیا ہے کہتا ہے کہ ضاد مخرج ظاء پڑھو ورنہ نماز باطل ہوگی اور تراویح آٹھ رکعت پڑھو بیس رکعت پڑھنا فضول ہے اور تقلید کسی امام کی نہ کرنا چاہئے جس حالت میں چاروں مذہب درست ہیں پھر امام اعظمؒ کی تقلید سے کیا فائدہ ہے جواب ہر ایک امر کا اپنی مہر سے مزین فرما کر ارسال کریں کہ اس شخص کو جواب دیا جائے۔

جواب: مخدوم من میاں جی گھیسا صاحب سلامت، بعد سلام یہ گذارش ہے کہ میں پرسوں تیسرے روز پیر کے دن دیوبند سے یہاں اپنے وطن میں پہنچا آپ کا خط ملا دیکھ کر رنج ہوا، کیا خدا کی قدرت ہے کہ آج کل جس طرف سے صدا آتی ہے یہی آتی ہے کہ وہاں مسلمانوں میں اختلاف ہے نزاع ہے، کہیں سے اتفاق کی خبریں نہیں آتیں ہاں کفار کے جتنے افسانے سنے جاتے ہیں کہ یوں اتفاق ہے اس طرح اتحاد ہے خیر بجز اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کے اور کیا کہئے آپ کی خوشنودی خاطر منظور ہے اس لیے

جواب لکھتا ہوں ورنہ ایسے جھگڑوں میں دخل دینا محض فضول سمجھتا ہوں۔

جناب من! جیسے کہ بے کی جگہ تے اور دال کی جگہ ذال اور حا کے بدلے خا اور شین کی عوض سین اور عین کے مقام پر غین اور لام کی مکان میم نہ کوئی پڑھتا ہے اور نہ کوئی جائز سمجھتا ہے اور ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک ہر کوئی اس بات کو سمجھتا ہے ایسے ہی ضاد کو چھوڑ کر ظاء پڑھنا بھی خلافِ عقل و نقل ہے یہ بات عقل و نقل کی رو سے من جملہ تحریف ہے جس کی برائی خود کلام اللہ میں موجود ہے پھر معلوم نہیں آج کل کے عالم کس وجہ سے ایسی نا معقول بات کہہ دیتے ہیں اور اہل اسلام کیوں ایسی بات تسلیم کر لیتے ہیں مگر شاید عوام فتوؤں کی مہروں کو دیکھ کر چل جاتے ہیں اور یہ کون جانے کہ کتابوں کا سمجھنا اور فتوؤں کا لکھنا ہر کسی کو نہیں آتا۔

اب تقلید کی بات سنئے! لاریب دین اسلام ایک ہے اور چاروں مذہب حق، مگر جیسے فن طبابت یونانی یا ڈاکٹری انگریزی ایک ہے اور سارے طبیب کامل قابل علاج اور ہر ایک ڈاکٹر لائق معالجہ ہے اور پھر وقت اختلاف تشخیص اطباء یا مخالفت رائے ڈاکٹران جس طبیب کا علاج یا جس ڈاکٹر کا معالجہ کیا جاتا ہے ہر بات میں اسی کا کہنا کیا جاتا ہے دوسرے طبیب کی یا دوسرے ڈاکٹر کی رائے نہیں سنی جاتی ایسے ہی وقت اختلاف ائمہ و مجتہدین جس امام یا مجتہد کا اتباع کیا جائے ہر بات میں اسی کی

تابعداری ضروری ہے، ہاں جیسے کبھی ایک طبیب یا ڈاکٹر کا علاج چھوڑ کر دوسرے کی طرف رجوع کر لیتے ہیں اور پھر بعد رجوع ہر بات میں دوسرے کا اتباع مثل اول کیا جاتا ہے ایسے ہی کبھی کبھی بعض بزرگوں نے زمانہ سابق میں کسی وجہ سے ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیا تھا اور بعد تبدیل مذہب ہر بات میں دوسرے ہی کا اتباع کیا، یہ نہیں کیا کہ ایک بات ان کی لی اور ایک بات اُن کی لی اور اس تدبیر سے ایک لامذہبی کا پانچواں انداز گھڑ لیا۔

امام طحاویؒ جو بڑے محدث اور فقیہ ہیں پہلے شافعی تھے پھر حنفی ہو گئے تھے بالجملہ بے تقلید کام نہیں چلتا، یہی وجہ ہوئی کہ کروڑوں عالم اور محدث گذر گئے پر مقلد ہی رہے۔

امام ترمذیؒ کو دیکھئے کتنے بڑے عالم اور فقیہ اور محدث تھے ترمذی شریف انہیں کی تصنیف ہے باوجود اس کمال کے مقلد ہی تھے اعتبار نہ ہو تو ترمذی شریف کو دیکھ لیجئے جب ایسے ایسے عالم اس کمال علمی پر مقلد ہی رہے امام شافعیؒ کی تقلید امام ترمذی نے کی اور امام طحاویؒ اور امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کی ہو پھر آج ایسا کون سا عالم ہوگا جس کے ذمہ تقلید ضروری نہ ہو اگر کسی بڑے عالم نے اماموں کی تقلید نہ کی بھی تو کیا ہوا اول تو کروڑوں کے مقابلہ میں ایک دو کی کون سنتا ہے جس عاقل

سے پوچھو گے یہی کہے گا کہ جس طرف ایک جہاں کا جہاں ہو وہی بات ٹھیک ہوگی بایں ہمہ یہ کون سی عقل کی بات ہے کہ اس بات میں عالموں کی چال ہم اختیار کریں یہ ایسی بات ہے کہ کوئی مریض جاہل کسی طبیب کو مرض کے وقت دیکھے کہ اپنا علاج آپ کرتا ہے اور دوسرے طبیب سے دوا نہیں پوچھتا یہ دیکھ کر بھی یہی انداز اختیار کرے اپنا علاج اپنے آپ کو نے لگے اور طبیبوں سے کام نہ رکھے تم ہی کہو ایسے آدمی عاقل کہلائیں گے یا بے وقوف، سو ایسے ہی کسی عالم کو غیر مقلد دیکھ کر جاہل اگر تقلید چھوڑ دیں تو یوں کہو علم تو تھا یا نہ تھا عقل دین بھی دشمنوں ہی کو نصیب ہوئی اور جاہلوں کو جانے دیجئے آج کل کے عالم یقین جانئے کُل نہیں تو اکثر جاہل ہی ہیں بلکہ بعض عالم تو جاہلوں سے بھی زیادہ جاہل ہیں، دو کتابیں اردو کی بغل میں دبا کر وعظ کہتے پھرتے ہیں اور علم کے نام خاک بھی نہیں جانتے کم سے کم علم اتنا تو ہو کہ ہر علم کی ایک کتاب طالب علم کو پڑھا سکے۔

باقی رہی تراویح اُس میں جو آج کل ملانوں نے تخفیف نکال دی ہے یعنی بیس کی آٹھ کر دی ہیں تو ہر ایک کو بوجہ آسانی یہ بات پسند آتی ہے پر یہ بات کوئی نہیں سمجھتا کہ آٹھ رکعتیں جو حدیث میں آئی ہیں تو وہ تہجد کی رکعتیں ہیں، تہجد اور چیز ہے اور تراویح اور چیز، تراویح کی بیس ہی رکعتیں ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہزارہا صحابہؓ تھے اس زمانہ سے لے کر آج

تک کسی نے بیس رکعت میں کچھ حجت نہ کی تھی مگر آج کل ایسے اَن پڑھے اُمّی عالم پیدا ہوئے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہؓ کی بھی غلطی نکالی، سبحان اللہ! یہ منہ اور مسور کی دال، باقی یہ کہنا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے بیس رکعتیں نہیں پڑھتے تھے یہ خیال خام ہے یہ بات اتنی بات سے کیوں کر نکل آئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بیس کا اہتمام شروع ہوا، دیکھئے پہلے زمانہ میں نکاح ثانی کا اس لیے چنداں اہتمام نہ تھا کہ اس نکاح کو اتنا بُرا نہیں سمجھتے تھے جب شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے یہ دیکھا کہ اس امر خیر کو آج کل معیوب سمجھنے لگے انہوں نے اس کا ذکر اپنی تصانیف میں کیا، آخر کار ان کی اولاد اور ان کے شاگردوں نے اس کو جاری کرنے میں کمر باندھی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ نکاح ثانی شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے خاندان کا ایجاد ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی بات نہیں۔

ایسے ہی بیس رکعت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے زمانہ کے صحابیوں کا ایجاد نہ سمجھے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی سمجھئے ورنہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سنّی نہ تھے ان کے زمانہ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سُنّی نہ تھے سب کے سب نعوذ باللہ بدعتی تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مٹا دیا اپنی سنت جاری کر دی اب تمہیں فرماؤ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا بُرا سمجھنے والا کون ہوتا ہے۔

میاں جیو صاحب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور اصحاب رضی اللہ عنہم کی پیروی کا حکم تو صحیح

صحیح حدیثوں میں موجود ہے ایک دو حدیث لکھے دیتا ہوں انہیں مولوی صاحب سے اُن کا ترجمہ کرا لینا جو آٹھ رکعت گاتے پھرتے ہیں۔

ایک حدیث تو یہ لیجئے: علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین من بعدی.

دوسری یہ لیجئے: اقتدوا بالذین من بعدی.

تیسری یہ لیجئے: اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم.

تـــــــــــــــــــــــــــــــت